مولانا حمید الدین فراہی اور جمہور علماء کے نزدیک اصولِ تاویل

Principles of Interpretation according to Maulānā Ḥamīd Uddīn Farāhī and mainstream of Scholars

DOI: 10.5281/zenodo.7486475

سیف اللہ خلیل الازھری *

انعام الرحمن **

سعدیہ رحمٰن ***

Abstract

This article aims to explore the principles of interpretation introduced by mainstream of scholars and Maulana Hameed Uddin Farāhī. His exegesis Niẓām ul Qur'ān is based on the principles introduced by him. It is undeniable fact that Qur'ān is a treasure of wisdom and ocean of knowledge. The more a diver dives into the layers of this ocean, the more he benefits from the precious jewels. The verses of the Qur'ān have been considered in every age but there are some words and verses in the Qur'an having multiple or unclear meaning which are known as Mutashābihāt. The interpreters have tried their best to determine its meaning considering its context etc., but Maulana Hameed Uddin Fahari introduced some new principles for the purpose and classified it into three types i.e., Primary principles, Probabilistic Principles, and baseless principles. According to Maulana Farāhī the latter is not a principle by itself, but he has mentioned it only to avoid it. The present article discusses it in detail.

Keywords: *Uṣūl ul Tāwīl (Principles of Interpretation), Hameed Uddin Farāhī*

ماہرین لسانیات کے ہاں تأویل:

تأویل (أ، و، ل) سے نکلا ہے [1] جس کا معنی ثانوی اور فرعی معنی سے اصلی معنی کی طرف لوٹنا ہے۔

لغوی اعتبار سے تأویل (تفعیل) کے وزن پر اسمِ مصدر ہے جس کے مآخذ کے بارے میں مختلف آراء ہیں، کچھ علماء کے نزدیک یہ (الأول) سے ہے، اور کچھ اسے (الایالہ) سے ماخوذ مانتے ہیں۔ علامہ جلال الدین السیوطی [2] فرماتے ہیں:

"تأویل کی اصل الأول ہے جس کا معنی لوٹانا ہے، گویا آیت کو اس کے ممکنہ معنی کی طرف لوٹایا جاتا ہے۔ اور یہ بھی کہا جاتا ہے

---

* پی ایچ ڈی سکالر، أصول الدین فیکلٹی، جامعۃ الأزہر مصر

** پی ایچ ڈی سکالر، شعبہ اسلامیات،، پشاور یونیورسٹی

*** لیکچرر، شعبہ علوم اسلامیہ، جناح کالج برائے خواتین، پشاور یونیورسٹی

کہ یہ الایالہ سے ہے جس کے معنی ہانکنے کے ہے، گویا مؤوِل کلام کو ہانکنے کے بعد معنی کو اپنی جگہ پر رکھ دیتا ہے۔[3]

علمائے اصول کے ہاں تأویل:

کسی دلیل کے پیش نظر لفظ کے راجح معنی کو ترک کر کے مرجوح معنی مراد لے لینا تاویل کہلاتا ہے۔[4]

علمائے علوم القرآن کے ہاں تأویل:

غور و فکر کے بعد ایک لفظ کے ایک ہی پہلو کو متعین کرنے کا نام "تاویل" ہے یا جو معنی اجتہاد و استنباط سے اخذ کیا جائے وہ تاویل ہے۔ تأویل کی یہ تعریف تفسیر کے معنی کے تحت بھی شامل ہے اس لحاظ سے کہ یہ سب کچھ قرآن کے معنی کے بیان اور اس کے معنی کو ظاہر کرنے سے باہر نہیں ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ اصولیین اور علمائے قرآن کے نزدیک تأویل میں کیا فرق ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ مفسرین اور علمائے قرآن کے نزدیک تأویل ایک مضبوط دلیل کی بنیاد پر ظاہر کو اس کے ظہور سے ہٹانا اور نہ ہٹانا بھی ہو سکتا ہے، لیکن اصولیین کے لیے دلیل مضبوط ہونے کے ساتھ ساتھ دلیل کا قطعی ہونا بھی ضروری ہے کیونکہ اصولیین کے مطابق تاویل کا مقصد لفظ سے شارح کی مرضی کو بیان کرنا ہے جو کسی دلیل کے پیش نظر لفظ کے راجح معنی کو ترک کر کے مرجوح معنی مراد لے لینا ہے جیسے ہم نے پہلے بیان کیا ہے۔

اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ جس معنی کی طرف ہم لفظ لوٹاتے ہیں لفظ اس معنی کا اصلاً متحمل بھی ہو، بصورت دیگر یہ تاویل نہیں بلکہ وہم اور مغالطہ ہو گا، اور اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ کسی دلیل کے پیش نظر لفظ کے راجح معنی کو ترک کر کے مرجوح معنی مراد لیا جائے ورنہ اس معاملہ میں خلط ملط ہونے کا قوی امکان ہے جس سے ہر کوئی جو چاہے اور جس طرح چاہے نصوص سے کھیل سکتا ہے۔ اسی طرح لازم ہے کہ لغوی معنی سے ہٹانے والی دلیل راجح ہو بصورت دیگر یہ فاسد تاویل کا سبب بن سکتی ہے۔

تاویل ہمیشہ بے لگام اور آزاد نہیں ہوتی بلکہ اس کے کچھ ضوابط، احکام اور مجالات ہوتے ہیں۔

جمہور علماء کے ہاں تأویل:

اول: قطعی نصوص میں تاویل کی بالکل گنجائش نہیں ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ [5] کیونکہ صیغہ عدد میں زیادتی و نقص کا کوئی احتمال نہیں۔

قطع سے مراد: خاص معنوں میں قطع وہ ہے جس میں اصلاً کوئی بھی احتمال نہ ہو، کیونکہ یہ یقینی طور پر اس کے معنی پر دلالت کرتا ہے، جس پر اجماع ہے۔ جبکہ عام معنوں میں قطع وہ ہے جس میں دلیل کی وجہ سے احتمال نہ ہو، اس لئے وہ دلیل جو تاویل کے دروازے کھول دیتی ہے کے سامنے آنے کے بغیر کوئی تاویل نہیں۔

کلی اصول، محکم، تشریعی قواعد، یا جو ضرورتِ دین سے ہو، کیونکہ یہ وہ بنیادیں ہیں جن پر شریعت قائم ہے، اور جن سے عام شرعی نظام قائم ہوتا ہے اور جس سے فرائض اور حرمات قائم ہوتے ہیں، پس یہ اور اس جیسی صورتیں (مسائل) تاویل کے دائرے میں نہیں آتے۔

دوم: نصِ محکم اور نص مفسر تاویل میں شامل نہیں ہے۔ کیونکہ اس میں شارح کا ارادہ قطعی طور پر واضح ہوتا ہے۔ اسی طرح وہ مجمل جس کی تفسیر کسی دلیلِ قطعی سے بیان کی گئی ہو تاویل کے دائرے سے باہر ہے اور ایسے ہی وہ خفی جس کی دلالت اس کے معنی پر واضح ہو چکی ہو جس میں کوئی شبہ اور ابہام نہ ہو تاویل کے دائرہ کار سے باہر ہے۔

سوم: مشترک لفظی اصولی تاویل میں نہیں آتا جیسا کہ ہم نے پہلے ہی بیان کیا۔

حنفی علمائے اصول کے مطابق صرف ظاہر اور نص میں تاویل ممکن ہے لیکن جمہور علمائے اصول کے مطابق ہے صرف ظاہر میں تاویل کی گنجائش ہے جبکہ نص میں کبھی بھی تاویل کی گنجائش نہیں اور یہی اس کے نص ہونے کا مطلب ہے۔

چہارم: لفظ اصولی طور پر تاویل کے قابل ہونا چاہیے۔ مطلب یہ ہے کہ لفظ اور تاویل سے جو معنی مقصود ہو ان میں لسانی یا عرفی یا اس جیسی نسبتوں میں کوئی نسبت ہو جو کلمہ کے حقیقی اور مجازی معنی کے درمیان مشہور ہو، اب اگر ان نسبتوں میں سے کوئی بھی نسبت نہ ہو تو یہ ایک باطل تاویل ہو گی۔ جیسے آپ شیر کو گدھے اور دریا کو پہاڑ اور درخت کو انسان سے تاویل کرتے ہیں۔

پنجم: اس کے بعد کوئی ایسی دلیل موجود ہے جو اس ظاہری لفظ کے معنی مرجوح کو راجح بنائے اور ظاہری طور پر راجح معنی کو ضعیف اور مرجوح بنائے۔

اور یہ دلیل زیادہ تر لغوی دلیل ہوتی ہے، کیونکہ اگر عرب مجازی معنی کے لیے مخصوص الفاظ یا تراکیب استعمال کرتے ہیں اور پھر یہ الفاظ اور تراکیب ان میں جاری و ساری ہوتے ہیں تو یہ حقیقت کا درجہ لیتے ہیں، جیسا کہ عرب کہتے ہیں: قامت الحرب علي ساق جنگ ایک ٹانگ پر لڑی گئی تھی۔ حمي الوطيس جنگ کے شعلے بھڑکے، اور وہ کہتے ہیں: هذا يصغر في جنب یہ فلاں کے پہلو سے چھوٹا ہے، ان میں سے کوئی بھی ظاہر کلام کا ارادہ نہیں رکھتا، بلکہ وہ پنڈلی کو سختی، وطیس جو کہ تنور ہے کو جنگ سے اور پہلو کو کسی اور چیز میں کچھ شامل کرنے کے معنی میں لیتے ہیں۔

ششم: تفسیر کے دوران عربی زبان کے اصول وضوابط کا التزام کرنا۔

ہفتم: اصول تفسیر کے قواعد کا التزام کرنا جیسے کلام کے سیاق وسباق کا لحاظ کرتے ہوئے مختلف اجزاء کو اس طرح ملانا تاکہ اس کا اول اس کے آخر سے مناسبت رکھتا ہو، اس لئے ضروری ہے کہ آیات اور سورتوں کے آپس میں ربط کو ظاہر کیا جائے اور اسی طرح سببِ نزول کو ظاہر کیا جائے اس کے معنی کی طرف اشارہ کرنے کے اعتبار سے، اور پھر اس کے اور نازل شدہ آیات کے درمیان ایک قوی ربط بنانا۔

علامہ فراہی [6] کے ہاں اصولِ تأویل:

علامہ فراہیؒ کی نظر میں تاویل کے تین اصول ہیں:

1۔ بنیادی اصول: اس سے مراد وہ اصل الاصول ہے جس کو اس وقت لیا جاتا ہے جب کلمات کے مختلف معانی کا احتمال نہ ہو۔

2۔ ترجیحی اصول: اگر الفاظ کے مختلف معانی ہو تو ان اصول کا سہارا لیا جاتا ہے۔

علامہ فراہیؒ فرماتے ہیں: اگر ہم ترجیحی اصول کو جانتے ہیں تو ہم ان کی مدد سے راجح کو لیتے ہیں اور مرجوح کو چھوڑ دیتے ہیں۔[7]

3۔ باطل اصول: ایسے اصول جن پر ہم بالکل اعتماد نہیں کرتے بلکہ ان سے اجتناب کرنے کی غرض سے ان کو بیان کرتے ہیں۔

1۔ بنیادی اصول، جو کہ تین ہیں:

اول: نظمِ کلام اور سیاق وسباق کی رعایت:

علامہ فراہیؒ کے مطابق یہ ترجیحی اصولوں میں سے نہیں ہے، کیونکہ کلام اس معنی کا احتمال نہیں کرتا جو اس کے سیاق، نظم اور ربط سے متصادم ہو، اس لئے کہ جب ہم دانش مندوں کے کلام میں نظمِ کلام اور سیاق وسباق کی مخالفت کو نقص مانتے ہیں پھر اس کو ہم خالقِ کلام اور وہ جس نے انسان کو وہ علم دیا جسے وہ نہ جانتا تھا، اور اسے بولنا سکھایا، کے کلام میں کس طرح خلل نہیں مانتے؟ لیکن علم میں کج فہم لوگوں نے اس کو منہدم کرنے کی کوشش کی اور مختلف باتیں گڑھ لیں جس سے مؤمنین میں سے کم فہم لوگ فتنوں میں پڑھ گئے، جیسا کہ اللہ تعالی فرماتے ہیں: **إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيرًا** [8] (ترجمہ: یقیناً اللہ تو یہ چاہتا ہے کہ اہلِ بیتِ نبیؐ سے گندگی کو دور کرے اور تمہیں پوری طرح پاک کر دے)۔ یہ آیت صرف امہات المؤمنین کے بارے میں نازل ہوئی ہے اور ان کے سوا اس کے مفہوم میں کوئی اور شامل نہیں، اس کلام میں نہ کوئی عموم ہے اور نہ ہی کوئی شمول جس پر آیت کریمہ کا سیاق وسباق دلالت کرتا ہو، جیسے کہ امام رازیؒ کا قول ہے: "اہل بیت کے بارے

میں مختلف اقوال ہیں، اور راجح یہ ہے کہ وہ آپ ﷺ کے اولاد، آپ ﷺ کی بیویاں، اور ان میں سے حضرت حسن، حضرت حسین اور حضرت علی رضی اللہ عنہم بھی شامل ہیں، اور یہ حضرات اہل بیت میں سے اس لئے ہیں کہ ان کا تعلق نبی ﷺ کی بیٹی کے ساتھ ہے، اور نبی ﷺ کی رفاقت میں تھے"[10]

دوم: شاذ معنی سے اجتناب کرنا

علامہ فراہی فرماتے ہیں: "قرآنی الفاظ کے وہی معنی لینے چاہئے جو معروف اور ثابت ہوں اور شاذ معنی کی طرف صرف ضرورت کے وقت ہی توجہ کیا جاتا ہے۔ اس کی ایک مثال اللہ تعالیٰ کی آیت کی یہ تاویل ہے إِنْ تَتُوبَا إِلَى اللَّهِ فَقَدْ صَغَتْ قُلُوبُكُمَا [11]، (ترجمہ: اگر تم دونوں اللہ سے توبہ کرتی ہو (تو یہ تمہارے لیے بہتر ہے) کیونکہ تمہارے دل سیدھی راہ سے ہٹ گئے ہیں) پس باطل پرستوں نے الصغو کا معنی کج روی لیا ہے اور اس کی تاویل کے لئے ایک باطل قرأت دلیل لی ہے جبکہ وہ قرأت جمہور قراء کے نزدیک ثابت نہیں ہے"۔[12]

سوم: قرآن کی تفسیر قرآن سے۔

قرآن مجید ایک ہی معاملہ کو کئی مواقع پر مختلف محل کے لحاظ سے الگ الگ انداز میں بیان کرتا ہے، کہیں اس کا ایک پہلو بیان ہوتا ہے اور کہیں اس کا دوسرا پہلو، اسی طرح کہیں اجمال ہوتا ہے تو کہیں تفصیل، مثلا ایک آیت ہے(إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَهَاجَرُوا وَجَاهَدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ)[13] (ترجمہ: جن لوگوں نے ایمان قبول کیا اور ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں اپنی جانیں لڑائیں اور اپنے مال کھپائے) اور دوسری جگہ آیا ہے کہ (وَالَّذِينَ آمَنُوا وَهَاجَرُوا وَجَاهَدُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ) [14] اور اس میں اللہ تعالی نے مال اور جان کا ذکر نہیں فرمایا اس لئے کہ وہ پہلے ہی واضح ہے۔ اس کے بعد آتا ہے (وَالَّذِينَ آمَنُوا مِنْ بَعْدُ وَهَاجَرُوا وَجَاهَدُوا مَعَكُم)[15]، یہاں اس آیت میں فی سبیل اللہ، مال اور جان کا ذکر نہیں فرمایا اس لئے کہ وہ پہلے ہی واضح ہے، جس پر معکم دلالت کرتا ہے۔ علامہ فراہی اس اصل پر تعلیقاً فرماتے ہیں کہ یہ ایک وسیع باب ہے جو بہت سے معانی کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ تاویل اور نظم القرآن کے درمیان فرق کرنا ممکن نہیں ہے، کیونکہ یہ دونوں اس طرح آپس میں لازم وملزوم اور ملے ہوئے ہیں کہ ان کو الگ کرنا ناممکن ہے، تاویلِ القرآن بالقرآن اور نظمِ قرآن کی رعایت کرتے ہوئے ہی ایسا ممکن ہے کہ ہم معنی المراد کے فہم تک پہنچ سکے کیونکہ قرآن کا بعض حصہ بعض حصے کی تشریح کرتا ہے اسی سے تفسیر بالنظائر مراد ہے اور یہ ایک واضح امر ہے کہ قرآن مجید ایک ہی معاملہ کو مختلف مواقع پر مختلف محل کے لحاظ سے الگ الگ انداز میں بیان کرتا ہے، کہیں اجمال ہوتا ہے تو کہیں تفصیل، پس ایک جگہ اجمال سے ذکر ہو دوسری جگہ تفصیل سے ذکر ہوتا ہے۔

اس میں علامہ فراہیؒ کے ہاں رعایتِ کلام یہ ہے کہ ایک ہی معنی مختلف عبارات سے نکلتا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: (وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ بِالْعَشِيِّ وَالْإِبْكَارِ)[16] (ترجمہ: اور صبح وشام اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرتے رہو) پس یہ بعض اوقات کے تعیین سے ظاہر ہے، اور دوسری جگہ ارشاد ہے: وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ الْغُرُوبِ (39) وَمِنَ اللَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَأَدْبَارَ السُّجُودِ (40)[17] (ترجمہ: اور اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرتے رہو، طلوع آفتاب اور غروب آفتاب سے پہلے، ور رات کے وقت پھر اُس کی تسبیح کرو اور سجدہ ریزیوں سے فارغ ہونے کے بعد بھی)، ایک اور جگہ ارشاد ربانی ہے(وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ حِينَ تَقُومُ (48) وَمِنَ اللَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَإِدْبَارَ النُّجُومِ (49))[18] (ترجمہ: تم جب اٹھو تو اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرو، رات کو بھی اس کی تسبیح کیا کرو اور ستارے جب پلٹتے ہیں اُس وقت بھی) ایک اور جگہ ارشاد ہے: (فَسُبْحَانَ اللَّهِ حِينَ تُمْسُونَ وَحِينَ تُصْبِحُونَ (17) وَلَهُ الْحَمْدُ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَعَشِيًّا وَحِينَ تُظْهِرُونَ (18))[19] (ترجمہ: پس تسبیح کرو اللہ کی جبکہ تم شام کرتے ہو اور جب صبح کرتے ہو، آسمانوں اور زمین میں اُسی کے لیے حمد ہے اور (تسبیح کرو اس کی) تیسرے پہر اور جبکہ تم پر ظہر کا وقت آتا ہے)

ایک اور جگہ ارشاد ربانی ہے: (فَاصْبِرْ عَلَى مَا يَقُولُونَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوبِهَا وَمِنْ آنَاءِ اللَّيْلِ فَسَبِّحْ وَأَطْرَافَ النَّهَارِ لَعَلَّكَ تَرْضَى (130))[20] (ترجمہ: پس اے محمدؐ، جو باتیں یہ لوگ بناتے ہیں اُن پر صبر کرو، اور اپنے رب کی حمد و ثنا کے ساتھ اُس کی تسبیح کرو سورج نکلنے سے پہلے اور غروب ہونے سے پہلے، اور رات کے اوقات میں بھی تسبیح کرو اور دن کے کناروں پر بھی، شاید کہ تم راضی ہو جاؤ)

ایک اور جگہ اللہ فرماتا ہے:(وَأَقِمِ الصَّلَاةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَزُلَفًا مِنَ اللَّيْلِ إِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ)[21] (ترجمہ: اور دیکھو، نماز قائم کرو دن کے دونوں سروں پر اور کچھ رات گزرنے پر در حقیقت نیکیاں برائیوں کو دور کر دیتی ہیں،)

ایک اور جگہ ارشاد باری تعالی ہے:(أَقِمِ الصَّلَاةَ لِدُلُوكِ الشَّمْسِ إِلَى غَسَقِ اللَّيْلِ وَقُرْآنَ الْفَجْرِ إِنَّ قُرْآنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُودًا (78) وَمِنَ اللَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهِ نَافِلَةً لَكَ عَسَى أَنْ يَبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَحْمُودًا (79))[22] (ترجمہ: نماز قائم کرو زوال آفتاب سے لے کر اندھیرے تک اور فجر کے قرآن کا بھی التزام کرو کیونکہ قرآن فجر مشہود ہوتا ہے، اور رات کو تہجد پڑھو، یہ تمہارے لیے نفل ہے، بعید نہیں کہ تمہارا رب تمہیں مقام محمود پر فائز کر دے)

علامہ فراہیؒ جس چیز کو ہمارا سامنے رکھنا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ آیات کے دلالت معنی کو واضح کرنا ضروری ہے، جیسا کہ وہ فرماتے ہیں: "معانی پر دلالت کرنے کے بہت سارے طریقے ہیں، جیسے کہ ایک آیت اگر کسی معنی پر دلالت کرتی ہے تو وہی

معنی کسی دوسری آیت کے معنی پر بھی دلالت کر سکتا ہے ور اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ دو آیتوں یا جملوں کا ملا ہوا ہونا بھی کسی پوشیدہ معنی پر دلالت کرے، پس اگر ہم ان دلالات کے طریقوں کو بیان کر سکتے ہیں تو اس اصل کا استعمال آسان ہو جائے گا۔

دوسری بات جس کی طرف علامہ فراہیؒ نے اصول تاویل میں اشارہ کیا ہے وہ ہے "نظمِ کلام کی رعایت"

پس کلام میں الفاظ، حذف، مقدر، تعریض میں اشتراک ہوتا ہے، اور اسی طرح سورت میں متعدد دلالتوں کی بنا پر جو مختلف اسالیب استعمال ہوتے ہیں ان میں بھی اشتراک ہوتا ہے جیسے امر، استفہام، عطف کی دلالتیں اگرچہ مختلف ہوتی ہیں لیکن ان میں ایک خاص قسم کا اشتراک ہوتا ہے۔ الفاظ کی ان ساری دلالتوں اور بیان کے ان سارے اسالیب کو جان لینے کے بعد ہی کسی خاص جگہ پر اصل مراد لیا جاتا ہے۔

اشتراک کی وجہ سے جہاں ایک سے زیادہ معنی کا احتمال ہو وہاں مطلوب معنی کا تعین کرنے کے لئے معین اصول ہیں، اور اسی طرح محذوف، مقدر، معرض بہ کا تعین کرنے کے لئے بھی اصول موجود ہیں، اور ان اصولوں میں سے ایک فیصلہ کن اصول ''نظمِ قرآن'' کا اصول ہے۔

ہم پھر وہی بات دہراتے ہیں جس کا ذکر ہم پہلے کر چکے ہیں کہ قرآن کریم کا ایک حصہ دوسرے حصے کی وضاحت کرتا ہے، جس کو تفسیر بالنظائر بھی کہتے ہیں۔ یہاں میں وہ بات بیان کرنا چاہوں گا جو علامہ فراہی نے اس حوالے سے کی ہے، اور پھر اس کے بعد علامہ فراہیؒ کے طرق تدبر پر روشنی ڈالتے ہیں۔

علامہ فراہی کے مطابق نظائر ایک دوسرے کی تفسیر کرتے ہیں، اور یہ ایک مضبوط اصول ہے، کیونکہ یہ قرآن کی مشترکہ تفہیم ہے[23] پھر انہوں نے تدبر قرآن کے کچھ طریقے بتائے:

ا۔ سب سے پہلے نظمِ کلام اور حسنِ تاویل میں غور و فکر سے مجمل اور مقدر چیز ظاہر ہو گی، جو آپ کو دو نظائر میں مطابقت پر دلالت کرے گی اور یہ مجمل و مقدر کے تعیین پر دوسری دلیل ہو گی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جو چیز ایک جگہ مجمل و مقدر ہوتی ہے وہی دوسری جگہ واضح اور بیّن ہوتی ہے اور یہ قرآن کریم کا عام اسلوب ہے۔

ب۔ جب آپ دو کلاموں کے درمیان مطابقت ڈھونڈتے ہیں تو سب سے پہلے آپ نے سیاق و سباق کو دیکھنا ہو گا یعنی نظمِ کلام کو، کیونکہ ہر کلام کا ایک خاص نظم ہوتا ہے اور یہ ضروری نہیں ہے کہ دو نظائر کے درمیان ایک جیسا نظم ہو، ہاں البتہ ایسا ممکن ہے کہ دو نظموں میں بعض وجوہ کی بنا پر مشابہت ہو۔

مزید فرماتے ہیں: ” ایک نظیر کو دوسرے نظیر پر محمول کرنے کے بھی قواعد وضوابط ہیں، اس اعتبار سے کہ اگر ایک کلمہ یا جملہ دو تاویلیں رکھتا ہو اور کئی نظائر کا احتمال ہو تو جب تک کہ ان میں سے کوئی ایک تاویل راجح نہ ہو وہ کسی خاص تاویل کی تائید نہیں کریں گے۔ اور اسی طرح جب راجح تاویل کی مثالیں کثرت سے ہونگی تو نظائر کی کثرت دلیل دلیل مانی جائے گی بصورت دیگر ساری تاویلیں ایک جیسی ہونگی۔ اس کی ایک آسان مثال "قرآن" ہے، جو مجموع اور متلو دونوں پر دلالت کرتا ہے مگر مجموع کی تاویل صحیح نہیں ہوگی کیونکہ جب نظائر کو جمع کیا جاتا ہے تو ہر جگہ متلو معنی ہی صحیح آتا ہے اور بعض دفعہ تو یہ ارجح ہوتا ہے“۔[24]

اس کے بعد علامہ فراہی بنیادی اصولوں میں سے چوتھے اصول کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ”مخاطب کا تعین بھی ضروری ہے۔ اس سے کلام کے رخ کو متعین کرنے میں آسانی ہوتی ہے۔ اس سے یہ پتا چلتا ہے کہ کہاں تسلی و تثبیت کا پہلو ہے اور کہاں زجر و توبیخ کا۔ کلام کا کون سا حصہ رأفت پر مبنی ہے اور کون سا حصہ غضب پر، کہاں وعدہ ہے اور کہاں وعید، کہاں استدلال ہے اور کہاں وسعت وغیرہ وغیرہ۔ اسی طرح خطاب کے تنوع پر بھی غور کرنا ضروری ہے“۔[25] علامہ فراہی نے اسے ان غلطیوں کی وجوہات میں سے ایک وجہ سمجھا جن کا شکار عام مفسرین ہوتے ہیں، فرماتے ہیں: اگر خطاب واحد سے ہو اور کوئی ظاہری قیاس بھی نہ ہو، تو عام مفسرین اس سے محمد ﷺ مراد لیتے ہیں۔ اس وجہ سے کہ آپ ﷺ لوگوں کے امام ہیں اس سے اصل مراد لوگ ہوتے ہیں چاہیں عمومی طور پر یا ان کا کوئی خاص گروہ۔ مثال کے طور پر ہم یہاں اللہ تعالی کا یہ کلام پیش کرسکتے ہیں کہ وَكَذَّبَ بِهِ قَوْمُكَ وَهُوَ الْحَقُّ قُلْ لَسْتُ عَلَيْكُمْ بِوَكِيلٍ (66) لِكُلِّ نَبَإٍ مُسْتَقَرٌّ وَسَوْفَ تَعْلَمُونَ (67)[26] (ترجمہ: تمہاری قوم اُس کا انکار کر رہی ہے حالانکہ وہ حقیقت ہے، اِن سے کہہ دو کہ میں تم پر حوالہ دار نہیں بنایا گیا ہوں، ہر خبر کے ظہور میں آنے کا ایک وقت مقرر ہے، عنقریب تم کو خود انجام معلوم ہو جائے گا) پس یہاں مخاطب واحد ہے جو محمد رسول اللہ ﷺ ہیں، اس کے بعد پھر مخاطب واحد آرہا ہے لیکن اس سے مراد امت ہے، جیسے فرماتے ہیں: وَإِذَا رَأَيْتَ الَّذِينَ يَخُوضُونَ فِي آيَاتِنَا فَأَعْرِضْ عَنْهُمْ حَتَّى يَخُوضُوا فِي حَدِيثٍ غَيْرِهِ وَإِمَّا يُنْسِيَنَّكَ الشَّيْطَانُ فَلَا تَقْعُدْ بَعْدَ الذِّكْرَى مَعَ الْقَوْمِ الظَّالِمِينَ ۔[27] (ترجمہ: اور اے محمدؐ! جب تم دیکھو کہ لوگ ہماری آیات پر نکتہ چینیاں کر رہے ہیں تو ان کے پاس سے ہٹ جاؤ یہاں تک کہ وہ اس گفتگو کو چھوڑ کر دوسری باتوں میں لگ جائیں اور اگر کبھی شیطان تمھیں بھلاوے میں ڈال دے تو جس وقت تمہیں اس غلطی کا احساس ہو جائے اس کے بعد پھر ایسے ظالم لوگوں کے پاس نہ بیٹھو)

یعنی تم پر واجب ہے کہ تم ان کو اللہ تعالی کی آیات کی یاد دہانی کرتے رہو، اور اگر وہ بحث و مباحثہ پر اتر آئیں تو ان سے اعراض کرو۔ پس ان کو دو چیزوں کا اہتمام کرنے کو کہا گیا: تذکیر اور اعراض۔ یہ اس آیت مبارکہ سے بھی واضح ہوتا ہے: وَإِذَا رَأَيْتَ الَّذِينَ يَخُوضُونَ فِي آيَاتِنَا فَأَعْرِضْ عَنْهُمْ حَتَّى يَخُوضُوا فِي حَدِيثٍ غَيْرِهِ وَإِمَّا يُنْسِيَنَّكَ الشَّيْطَانُ فَلَا تَقْعُدْ بَعْدَ

الذِّكْرَى مَعَ الْقَوْمِ الظَّالِمِينَ (68) [28] (ترجمہ: اُن کے حساب میں سے کسی چیز کی ذمہ داری پرہیز گار لوگوں پر نہیں ہے، البتہ نصیحت کرنا اُن کا فرض ہے شاید کہ وہ غلط روی سے بچ جائیں)

یعنی کافروں کے بارے میں مؤمنین سے بغیر تذکیر کوئی پوچھ گچھ نہیں، تذکیر کے بعد ان سے اللہ تعالی کفار کے کفر کے بارے میں سوال نہیں کریں گے، اس لئے تذکیر کے بعد وہ کفار کے برے اعمال سے بری ذمہ ہیں۔ قرآن بھی اس معنی پر دلالت کرتا ہے، جیسا کہ ارشاد ربانی ہے: ٱ وَقَدْ نَزَّلَ عَلَيْكُمْ فِي الْكِتَابِ أَنْ إِذَا سَمِعْتُمْ آيَاتِ اللَّهِ يُكْفَرُ بِهَا وَيُسْتَهْزَأُ بِهَا فَلَا تَقْعُدُوا مَعَهُمْ حَتَّى يَخُوضُوا فِي حَدِيثٍ غَيْرِهِ إِنَّكُمْ إِذًا مِثْلُهُمْ إِنَّ اللَّهَ جَامِعُ الْمُنَافِقِينَ وَالْكَافِرِينَ فِي جَهَنَّمَ جَمِيعًا (140) [29]. [30] (ترجمہ: اللہ اِس کتاب میں تم کو پہلے ہی حکم دے چکا ہے کہ جہاں تم سنو کہ اللہ کی آیات کے خلاف کفر بکا جارہا ہے اور ان کا مذاق اڑایا جارہا ہے وہاں نہ بیٹھو جب تک کہ لوگ کسی دوسری بات میں نہ لگ جائیں اب اگر تم ایسا کرتے ہو تو تم بھی انہی کی طرح ہو یقین جانو کہ اللہ منافقوں اور کافروں کو جہنم میں ایک جگہ جمع کرنے والا ہے)

اور کبھی تو پورا اشارہ لوگوں ہی کی طرف ہو۔ خطاب تو واحد کے لئے ہو لیکن حقیقت میں وہ بغیر واسطہ نبی مکرم ﷺ لوگوں کی طرف ہو، اور یہ اسلوب التفات کے ذریعے نبی مکرم ﷺ کے خطاب کے بعد یا اس سے پہلے آتا ہے اور یہ ان لوگوں کے لئے سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے جو غور و فکر نہیں کرتے اور جو بہترین تاویل نہیں چاہتے اور ضمائر کے منتشر ہونے سے بھاگتے ہیں، حالانکہ یہی التفات ہے، اس کی ایک مثال اللہ تعالی کا یہ کلام ہے: وَقَضَى رَبُّكَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا إِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ أَحَدُهُمَا أَوْ كِلَاهُمَا فَلَا تَقُلْ لَهُمَا أُفٍّ وَلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَهُمَا قَوْلًا كَرِيمًا (23) وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيَانِي صَغِيرًا (24) [31] (ترجمہ: تیرے رب نے فیصلہ کر دیا ہے کہ: تم لوگ کسی کی عبادت نہ کرو، مگر صرف اُس کی والدین کے ساتھ نیک سلوک کرو اگر تمہارے پاس اُن میں سے کوئی ایک، یا دونوں، بوڑھے ہو کر رہیں تو انہیں اف تک نہ کہو، نہ انہیں جھڑک کر جواب دو، بلکہ ان سے احترام کے ساتھ بات کرو، اور نرمی و رحم کے ساتھ ان کے سامنے جھک کر رہو، اور دعا کیا کرو کہ "پروردگار، ان پر رحم فرما جس طرح اِنہوں نے رحمت و شفقت کے ساتھ مجھے بچپن میں پالا تھا)

پس یہاں خطاب ایک بار واحد کے صیغے اور دوسری مرتبہ جمع کے صیغے کے ساتھ کیا گیا ہے، دونوں سے مراد صرف عموم ہے۔ جو ادنی معرفت بھی رکھتا ہے اس سے یہ سب پوشیدہ نہیں کہ نبی اکرم ﷺ کے والدین بقید حیات نہیں تھے کہ ان کو ان کے ساتھ احسان کا معاملہ کرنے کو فرمایا جاتا۔ لیکن وہ آیات جن میں فہم کے علاوہ عمومی معنی مراد لینے کے لئے کوئی قطعی دلیل نہ ہو، تو وہ فہمِ اسالیبِ کلام اور تاویل کے جاننے سے ہی آتا ہے۔ [32]

2۔ ترجیحی اصول، جو کہ پانچ ہیں:

اول: کلام کے توجیہات کی امکانی صورت میں اس مفہوم کو ترجیح دیناجو موقع محل اور عمود کلام سے زیادہ مناسبت رکھتاہو۔

کیونکہ ہر ایک لفظ کے کئی اطراف اور جہتیں ہیں جو اس کے لئے اس کے معنی جیسی ہوتی ہیں، اسی طرح ہر امر واقع اور ہر قصہ کے بھی اطراف اور جہتیں ہوتے ہیں۔ جس طرح ایک مشترک لفظ کو اس کے موقع محل کے مطابق تاویل کی جاتی ہے، اسی طرح ضروری ہے کہ ہم الفاظ کو بھی ان کے موقع محل کے مطابق تاویل کریں۔ مثال کے طور پر کامل یکتائی کی صفت صرف اللہ تعالی کے لئے خاص ہے، اس کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالی کا ذکر مختلف اسماء کے ساتھ متعدد مقامات پر ہوا ہے اور ترتیب میں ہر جگہ یکسانیت نہیں ہے۔ مثال کے طور پر:**قُلْ أَعُوذُ بِرَبِّ النَّاسِ (1) مَلِكِ النَّاسِ (2) إِلَهِ النَّاسِ (3)**[33]، (ترجمہ: کہو، میں پناہ مانگتا ہوں انسانوں کے رب، انسانوں کے بادشاہ، انسانوں کے حقیقی معبود کی)اسی طرح: **رَبِّ الْعَالَمِينَ (2) الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ (3) مَالِكِ يَوْمِ الدِّينِ (4)**[34]، (ترجمہ: جو تمام کائنات کا رب ہے، رحمان اور رحیم ہے، روز جزا کا مالک ہے)اسی طرح: **الْمَلِكِ الْقُدُّوسِ الْعَزِيزِ الْحَكِيمِ (1)**[35]، (ترجمہ: بادشاہ ہے، قدوس ہے، زبردست اور حکیم ہے) اسی طرح:**العزیز العفور**۔[36]، (ترجمہ: وہ زبردست بھی ہے اور درگزر فرمانے والا بھی) اسی طرح:(**الْمَلِكُ الْقُدُّوسُ السَّلَامُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَيْمِنُ الْعَزِيزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ**)[37] (ترجمہ: وہ بادشاہ ہے نہایت مقدس، سراسر سلامتی، امن دینے والا، نگہبان، سب پر غالب، اپنا حکم بزور نافذ کرنے والا، اور بڑا ہی ہو کر رہنے والا)

پس قرآن پر تدبر نہ کرنے والا نہ تو اس کے کلمات کے موقع محل کی طرف ملتفت ہوتا ہے، نہ ہی کلمہ کی سمت کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے، جبکہ یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ جب بابصیرت شخص کے لئے بعض روشن جہات ظاہر ہو جانے کے بعد بھی وہ تدبر کو ترک کرے۔

پس اگر اس اصول میں آپ کو مہارت حاصل ہوتی ہے تو انبیاء اور رسل کے اسماء میں تدبر کرنا آپ کے لئے آسان ہو گا، اس کے باوجود کہ ان کے درجات مختلف ہیں آپ ان کے اسماء کو ایک خاص ترتیب سے پائے گے۔ اور اگر آپ ان کے موقع محل پر غور وفکر کروگے تو آپ بہت سے مخفی گوشے پاؤ گے، اور ان کا موقع محل ڈھونڈنا مشکل بھی نہیں ہے۔ اسی طرح قصص اور احکام کی ترتیب میں بھی خاص اشارات ہوتے ہیں۔ حاصل کلام یہ ہے کہ:"موقع محل سے ہی ایک چیز کے اشارات واعتباریت لئے جاتے ہیں جیسا کہ ایک کلمہ مشترکہ کا معاملہ ہے۔ پس پہلا اصول یہ ہے کہ مختلف احتمالات میں نظم قرآن ہی فیصلہ کرتی ہے۔ اس اصول کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ ہم لفظ کو اگرچہ وہ غیر مشترک بھی ہو ایک ہی معنی پر محصور نہ کریں، جیسا کہ بعض اہل الرائے کا ماننا ہے – اسلئے کہ ایک لفظ میں مجاز، حقیقت، عام، خاص اور بھی کئی جہات کے معنی ہوتے ہیں اور یہ لفظ مقتضی حال کے مطابق ان تمام معنوں میں استعمال ہو سکتا ہے۔

دوم: کلام میں اگر مختلف احتمالات ہوں تو اس احتمال کو ترجیح حاصل ہو گی جس کی نظیر قرآن مجید میں موجود ہو، جیسے اللہ تعالی کا فرمان ہے: وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ يَحُولُ بَيْنَ الْمَرْءِ وَقَلْبِهِ وَأَنَّهُ إِلَيْهِ تُحْشَرُونَ (24)[38] (ترجمہ: اور جان رکھو کہ اللہ آدمی اور اس کے دل کے درمیان حائل ہے اور اسی کی طرف تم سمیٹے جاؤ گے) امام صاحب فرماتے ہیں کہ اس میں دو تاویلیں ہیں: ایک تو یہ ہے کہ اللہ تعالی تمہارے راز تم سے زیادہ جانتا ہے۔ اور دوسری تاویل یہ ہو گی کہ اللہ تعالی انسان کو اس اس کے ارادے سے روکتا ہے۔

پہلی تاویل کی نظیر قرآن کریم میں موجود ہے اور نظم قرآن بھی اس کی تایید کرتا ہے، کیونکہ (تحشرون) کا تصور دل میں اللہ تعالی کا تقوی پیدا کرتا ہے اسی لئے متعدد مقامات پر اس کا ذکر تقوی کے ساتھ آیا ہے، اور اللہ تعالی کے سوا کوئی تقوی کو نہیں جانتا۔ گویا یہاں یہ بات کہی گئی ہے کہ اللہ تعالی کا تقوی اختیار کرو کیونکہ وہ تمہارے رازوں سے خوب واقف ہے اور تمہیں اس کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔ پس یہ معنی سے بھی ملتا ہے اور ایک طرف سے نظم سے بھی۔

رہی دوسری تاویل: کہ وہ تبارک وتعالی آدمی کو اس کے ارادے سے روکتا ہے۔

اس کی نظیر بھی قرآن کریم میں موجود ہے، لیکن سیاقِ کلام اس تاویل کی تائید نہیں کرتا۔ اس کی بنیاد لفظی مشابہت پر ہے، چنانچہ ارشاد ہوا ہے: وَحِيلَ بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ مَا يَشْتَهُونَ۔ [39] (ترجمہ: اُس وقت جس چیز کی یہ تمنا کر رہے ہوں گے اس سے محروم کر دیے جائیں گے) یعنی جو وہ چاہ رہے ہونگے اس سے روکے اور منع کئے جائے گے۔ یہ بھی ایک اصول ہے مگر مرجوح ہے ان وجوہات کی بنا پر جن کا ہم نے ذکر کیا، پس ایک مشترک لفظ مختلف معانی کے لئے آتا ہے، لیکن اس پر سیاق اور معنی کی صحت کی روشنی میں ہی حکم لگایا جائے گا۔ جیسے اللہ تعالی کے کلام میں کلمہ: "امت": إِنَّ إِبْرَاهِيمَ كَانَ أُمَّةً قَانِتًا لِلَّهِ ۔[40] (ترجمہ: واقعہ یہ ہے کہ ابراہیمؑ اپنی ذات سے ایک پوری امت تھا) کو اس معنی میں نہیں لیا جائے گا جس معنی میں دوسری جگہ لیا جاتا ہے، کیونکہ وہ معنی یہاں سیاق، نظم اور صحت معنی کے ساتھ ملاپ نہیں رکھتا، علاوہ ازیں یہاں جو معنی مراد ہے اس کی نظیر قرآن کریم میں کئی نہیں ملتی، اس لئے کہ امت دوسرے مقامات پر قرآن کریم میں یا تو ایک مدت کے لیے یا لوگوں کے ایک گروہ کے لیے یا راستے کے لیے استعمال کیا گیا ہے، لیکن اگر ہم پہلے اور دوسرے اصول پر عمل کریں گے ہمارے لئے اصل مطلوبہ معنی واضح ہو جائے گا۔

جہاں تک پہلے اصول کا تعلق ہے: امت کے بعد لفظ "قانتا" اس کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ یہ امت معصومہ ہے۔

اور جہاں تک دوسرے اصول کا تعلق ہے: تو اس کے نظائر کی موجودگی کی وجہ سے ہے جو اس کی اطاعت کی صفات میں بیان کی گئی ہیں، نیکی کی تمام صفات میں اس کی مکمل ہونے کی وجہ سے، جیسا کہ ابونواس نے فضل بن ربیع کی مدح میں بیان کیا ہے:

"ليس على الله بمستنكر أن يجمع العالم في واحد"[41]

ترجمہ: "یہ اللہ تعالی کے لیے مشکل نہیں ہے کہ عالَم کی تمام صفات کو ایک ہی شخص میں اکٹھا کرے"

سوم: اگر معنی کسی ایسی عبارت کا مقتضی ہو جو کلام میں مذکور نہیں تو یہ مرجوح ہو گا، اس کی مثال وہ استدلال ہے جو امام شافعیؒ نے "من لم يتغن بالقرآن"[42] کی شرح میں تغنى بالقرآن کے بیان میں کی ہے جو سفیان بن عیینہ[43] کی شرح کے بالکل مختلف ہے، جو اس کو یستغنی کے معنی میں لیتا ہے۔ جب امام شافعی رحمہ اللہ سے اس کی وجہ پوچھی گئی تو آپ نے فرمایا: "ہم جانتے ہیں کہ اگر استغناء مراد ہوتا تو آپ ﷺ فرماتے "من لم يستغن بالقرآن" لیکن جب کہا گیا "من لم يتغن بالقرآن" ہم نے جان لیا کہ اس سے مراد تغنى ہے۔

چہارم: ہمیشہ کلام میں احسن پہلو کو ترجیح حاصل ہو گی: اس سے مراد یہ ہے کہ جو احتمال امور عالیہ اور مکارم اخلاق کے شایان شان ہو، دل اسے بلا تأمل قبول کرتا ہو، محکمات قرآنی کے موافق ہو، اللہ اور اس کے رسول سے زیادہ حسن ظن پر مبنی ہو اور عربیت کے لحاظ سے زیادہ نمایاں ہو وہ قابل ترجیح ہو گا۔

تاویل کے بنیادی اصولوں کو مد نظر رکھ کر کلام میں احسن پہلو کو ترجیح دینا تفسیر بالرائے تصور نہیں کی جائے گی۔ ان کو روایات پر ترجیح دی جائے گی اس لئے کہ اکثر ان میں سے اہل تاویل کی آراء ہیں جو صحیح نہیں ہو سکتی۔

پنجم: اس کی دو قسمیں ہیں:

الف: لغت کے لحاظ سے زیادہ ثابت شدہ معنی کو اپنانا:

مثال کے طور پر: کلام اللہ میں الشوی کا معنی: نَزَّاعَةً لِلشَّوَى ۔[44]، عموماً کلامِ عرب میں اس سے پنڈلی کا گوشت معنی لیا جاتا ہے۔

علامہ فراہی فرماتے ہیں: "علامہ عبد القادر دہلوی[45] نَزَّاعَةً لِلشَّوَى کا معنی تعین کرنے میں کامیاب نہیں ہوئے ہیں، اس لئے کہ انہوں نے اسے جگر تصور کیا، جبکہ موقع محل جس میں اس کا ذکر ہوا ہے وہ عذاب کی شدت ہے۔ انہوں نے اس پر سیاق سے استدلال کیا، کیونکہ جس موقف کے بیان میں اس کا ذکر آیا ہے وہ: وَأُزْلِفَتِ الْجَنَّةُ لِلْمُتَّقِينَ ، وَبُرِّزَتِ الْجَحِيمُ لِلْغَاوِينَ، تدعو الجحيم الكفار وتخرج لظاها، اور یہ سب اس کے پنڈلی کے گوشت کی ہی طرف اشارہ کرتا ہے

۔اب جہاں تک ان کے جگر نکالنے کی بات ہے تو اس کا ذکر قرآن کریم میں نہیں آیا ہے، اس اعتبار سے کہ جب وہ جہنم میں داخل ہونگے ان کے دل و جگر باہر نہیں نکالے جائیں گے۔ پھر فرماتے ہیں کہ اسی طرح اس نے بھی غلطی کی ہے جس نے اسے سر کی کھال سمجھا ہے، اس لئے کہ "الشوی" کا پنڈلی کے گوشت کے لئے استعمال ہونا عام اور شائع ہے۔ سر کی کھال کے لئے "الشواۃ" استعمال ہوتا ہے اور اس میں بھی کئی اور معنی کا احتمال موجود ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ قرآن و حدیث میں کہیں یہ ذکر نہیں ہے کہ کفار و مشرکین سر کے بل جہنم میں داخل کئے جائیں گے کہ ان کے سروں کی کھال جھلس جائے۔ پس اگر الشوی کے دو معانی یکساں طور پر مشہور ہوتے تب بھی اختیار اسی کو کرنا چاہیے جو نظم قرآن کے زیادہ موافق ہو۔ اور پھر وہ معنی جو غیر معروف اور غیر معتمد ہو اس کو کیسے لیا جاسکتا ہے۔ اسی لئے وہ اس بات کو دہراتے ہوئے فرماتے ہیں: "یہ بھی کلام میں احسن پہلو کو ترجیح دینے جیسا ہے۔ یہاں لفظ کے اس معنی کو ترجیح ہوگی جو لغت کے لحاظ سے زیادہ ثابت شدہ ہو کیونکہ جو معنی کلامِ عرب میں زیادہ مستعمل ہوا ہے اسے چھوڑنا درست نہیں اِلا یہ کہ وہ نظمِ کلام، استعمالات قرآن اور دینی عقائد کے خلاف ہو۔"[46]

تعقیب: علامہ فراہی نے اس آیت **(نَزَّاعَةً لِلشَّوَى)** میں الشوی کا معنی صرف پنڈلی مراد لیا ہے جو کہ مرجوح ہے، کیونکہ یہ کثیر المعانی لفظ ہے جس کا معنی چمڑا، سر کے بال، ہاتھ پیر وغیرہ کے ہیں جیسا کہ امام ماتریدی اور امام نسفی فرماتے ہیں:

''والشوى: قيل: هي مكارم خلقه. وقيل: هي القوائم والأطراف. وقيل: هي الجلود. والأصل أن نار جهنم تعمل على أصحابها كل قبيح وكل مستشنع مستفظع، فإن شئت صرفت ذلك إلى الأرجل، وإن شئت إلى الجلود، وإن شئت إلى مكارم خلقه الأخلاق؛ لأن التقبيح في كل ذلك موجود''[47]

''نزاعة {للشوى} لأطراف الإنسان كاليدين والرجلين أوجمع شواة وهي جلدة الرأس تنزعها نزعاً فتفرقها ثم تعود إلى ما كانت''[48]

ب۔ لفظی اعتبار سے شاذ اور منکر کو ترک کیا جائے گا:

علامہ فراہیؒ کی نظر میں لازم ہے کہ احسن وجوہ کو اختیار کرنے کے لئے معنی لغت اور قرآن کے موافق ہو اور ساتھ ہی اس میں کوئی تکلف بھی نہ ہو، جیسے اللہ تعالی کا فرمان ہے:(**لَقَدْ مَنَّ اللَّهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ إِذْ بَعَثَ فِيهِمْ رَسُولًا مِنْ أَنْفُسِهِمْ**)[49] (ترجمہ: درحقیقت اہل ایمان پر تو اللہ نے یہ بہت بڑا احسان کیا ہے کہ اُن کے درمیان خود انہی میں سے ایک ایسا پیغمبر اٹھایا)

کہا جاتا ہے اس میں "أَنفَسِهِمْ "ف کے فتحہ کے ساتھ ہے جو کہ ایک باطل تاویل ہے کیونکہ ایک تو معنی شاذ ہے اور اگر اللہ تعالی فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ اس کی قوم سے ہے تو ایک ظاہری بات ہے اس میں کوئی عیب نہیں، علاوہ ازیں عرب أَنفَسِهِمْ کے صیغے کا استعمال نہیں کرتے بلکہ وہ اس کے لئے "من خیارھم" ،یا اس جیسی تعبیر استعمال کرتے ہیں۔ یہاں جو

احسان اللہ تعالی جتاتے ہیں وہ بھی اسی صورت اور بڑا ہو گا جب رسول ﷺ ان ہی کی قوم میں سے ہونگے اور اس کے علاوہ یہ ابراہیمؑ کی بھی دعا ہے جیسا کہ سورۃ البقرہ میں ارشاد ہوا ہے: **وَإِذْ يَرْفَعُ إِبْرَاهِيمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَإِسْمَاعِيلُ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ (127) رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا أُمَّةً مُسْلِمَةً لَكَ وَأَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا إِنَّكَ أَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ (128)** [50]. (ترجمہ: اور یاد کرو ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ جب اس گھر کی دیواریں اٹھا رہے تھے، تو دعا کرتے جاتے تھے: "اے ہمارے رب، ہم سے یہ خدمت قبول فرمالے، تو سب کی سننے اور سب کچھ جاننے والا ہے، اے رب، ہم دونوں کو اپنا مسلم (مُطیع فرمان) بنا، ہماری نسل سے ایک ایسی قوم اٹھا، جو تیری مسلم ہو، ہمیں اپنی عبادت کے طریقے بتا، اور ہماری کوتاہیوں سے درگزر فرما، تو بڑا معاف کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے، اور اے رب، ان لوگوں میں خود انہیں کی قوم سے ایک ایسا رسول اٹھائیو، جو انہیں تیری آیات سنائے، ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دے اور ان کی زندگیاں سنوارے تو بڑا مقتدر اور حکیم ہے)[51]

3۔ باطل اصول:

آخر میں امام صاحب نے تیسرا اصول بیان کیا ہے جس کا نام انہوں نے باطل اصول رکھا ہے، باطل اصولوں میں سے علامہ فراہی نے اس اصول کے علاوہ کسی اور باطل اصول کا ذکر نہیں کیا۔

اس حوالے سے خلاصہ کلام اس طرح ہے جس طرح علامہ فراہی خود بیان کرتے ہیں: "تم راہ ہدایت قرآن سے سیکھو اور اسی پر اپنے دین کی بنیاد رکھو اس کے بعد احادیث رسول ﷺ پر نظر ڈالو اور اگر کوئی روایت قرآن سے متصادم نظر آئے تو اس کی تاویل قرآن کی روشنی میں ہی کرو۔ اب اگر دونوں میں مطابقت پیدا ہو جاتی ہے تو تمہاری آنکھیں ٹھنڈی ہوں گی اور اگر دونوں میں مطابقت پیدا نہ ہو سکے تو حدیث کے باب میں توقف کرو اور قرآن پر عمل کرو"۔ یہی وہ اصول تاویل ہیں جو علامہ فراہی نے اپنی تفسیر (نظام القرآن وتأويل الفرقان بالفرقان) پر لاگو کئے اور اس کے لئے کسی دلیل کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ ان کی تفسیر پر صرف ایک نظر ڈالنے سے قاری اس نتیجہ پر پہنچ جائے گا۔

حواشی

[1] - الأزہري، أبو منصور، **تھذیب اللغۃ**، تحقیق: محمد عوض، (بیروت: دار إحیاء التراث العربي، ۲۰۰۱ء) ۳۲۹:۱۵

[2] - آپ کا پورا نام عبد الرحمن بن ابی بکر ہے، جلال الدین آپ کا لقب ہے، آپ بہت نامور عالم، ادیب اور مؤرخ تھے، ۸۴۹ھ میں پیدا ہوئے اور ۹۱۱ھ کو قاہرہ میں فوت ہوئے، آپ کی شاہکار کتابوں میں "الاتقان فی علوم القرآن"، لباب النقول فی اسباب النزول، حسن المحاضرہ فی تاریخ مصر والقاہرہ اور تفسیر درمنثور شامل ہیں۔ ابن حماد الحنبلی، **شذرات الذہب فی اخبار من ذہب** تحقیق: عبد القادر الارناووط، (دمشق: دار ابن کثیر، ۱۹۸۶ء) ۵۱:۷

[3] - السیوطي، جلال الدین، **الإتقان في علوم القرآن** (القاہرۃ: الھیئۃ المصریۃ العامۃ للکتاب، ۱۹۷۴ء) ۴:۱۹۲

[4] - الآمدي، سیف الدین، **الإحکام في أصول الأحکام**، تحقیق: عبد الرزاق عفیفي، (دمشق، المکتب الإسلامي، ۱۴۰۲ھ) ۳:۵۳

5 - القرآن، ۲:۱۹۶

[6] - آپ کا پورا نام عبد الحمید بن عبد الکریم فراہي ہے، ۱۲۸۰ھ کو آعظم گڑھ انڈیا میں پیدا ہوئے جبکہ ۱۳۴۹ھ میں فوت فوئے۔ "نظام القرآن وتأویل الفرقان بالفرقان"، "جمہرۃ البلاغۃ" اور "إمعان في أقسام القرآن" آپ کی شاہکار تصانیف ہیں۔ مزید تفصیل کے لئے دیکھئے: فراہي، عبد الحمید، **نظرات جدیدۃ في تفسیر ألفاظ قرآنیۃ**، تحقیق: د. محمد أجمل أیوب (تیونس: دار الغرب الإسلامي ۲۰۰۲ء) ۱۳

[7] - فراہي، عبد الحمید، **التکمیل في أصول التأویل** (آعظم گڑھ: انڈیا، الدائرۃ الحمیدیۃ ۱۹۹۱ء) ۲۶۲

8 - القرآن، ۳۳:۳۳

9 - امام رازیؒ کا پورا نام محمد بن عمر بن الحسین بن الحسن ہے، آپ کی کنیت ابو الفضل جبکہ فخر الدین آپ کا لقب ہے، ابن الخطیب کے نام سے بھی آپ کو جانا جاتا ہے۔ آپ پچیس رمضان ۵۴۴ھ کو ایران کے شہر "رے" میں پیدا ہوئے، اسی شہر کی نسبت کی وجہ سے آپ کو رازی کہا جاتا ہے۔ ۶۰۶ھ کو ہرات میں فوئے۔ المحصول في علم الأصول، معالم أصول الدین اور مفاتیح الغیب آپکی شاہکار تصانیف ہیں۔ مزید تفصیل کے لئے دیکھئے: ابن خلکان، **وفیات الأعیان وأنباء أبناء الزمان** (بیروت: دار صادر ۱۹۷۱ء) ۴:۲۴۸

10 - رازي، **مفاتیح الغیب** (بیروت: دار إحیاء التراث العربي ۱۴۲۰ھ) ۲۵:۱۶۸

11 - القرآن: ۶۶:۴

[12] - فراہي، عبد الحمید، **التکمیل في أصول التأویل**، ۲۶۳

13 - القرآن، ۸:۲۷

14 - القرآن، ۸:۷۴

15 - القرآن، ۸:۷۵

16 - القرآن، ۴۰:۵۵

17 - القرآن، ۵۰:۳۹، ۴۰

18 - القرآن، ۵۲:۴۸، ۴۹

19 - القرآن، ۳۰:۱۷، ۱۸

20 - القرآن، ۲۰:۱۳۰

21 - القرآن، ۱۱:۱۱۴

22 - القرآن، ۱۷:۷۸، ۷۹

[23] - فراہي، **التکمیل في أصول التأویل**، ۲۶۳

[24] - فراہي، التكميل في أصول التأويل، ٢٦٥

25 - نفس مصدر، ۲۶۷

26 - القرآن، ۶:۶۶، ۶۷

27 - القرآن، ۶:۶۸

28 - القرآن، ۶:۶۹

29 - القرآن، ۴:۱۴۰

30 - فراہي، حمید الدین، **أساليب القرآن**) أعظم گڑھ - انڈیا، الدائرة الحمیدیة ۱۹۹۱ء) ۱۶۱

31 - القرآن، ۱۷:۲۳، ۲۴

32 - فراہي، حمید الدین، **أساليب القرآن** ۱۶۳

33 - القرآن ، ۱۱۴:۱، ۲، ۳

34 - القرآن ، ۱:۲، ۳، ۴

35 - القرآن، ۶۲:۱

36 - القرآن ، ۶۷:۲

37 - القرآن ، ۵۹:۲۳

38 - القرآن، ۸:۲۴

39 - القرآن ، ۳۴:۵۴

40 - القرآن، ۱۶:۱۲۰

41 - أبو نواس، **ديوان أبي نواس**، (أبو ظبي: دار الكتب الوطنية، ۲۰۱۰ء) ۱۹۳

42 - السجستاني، أبو داود، **سنن أبي داود**، كتاب الصلاة، باب استحباب الترتيل في القراءة، تحقيق: محمد محيي الدين، (بيروت: المكتبة العصرية) ۱۵۴:۹، حدیث نمبر: ۱۴۶۹ بخاری کے الفاظ کچھ یوں ہے "لَمْ يَأْذَنِ اللَّهُ لِشَيْءٍ مَا أَذِنَ لِلنَّبِيِّ أَنْ يَتَغَنَّى بِالقُرْآنِ" البخاري **صحيح البخاري، محمد بن اسماعيل**، كتاب فضائل القرآن، باب من لم يتغن بالقرآن، (بيروت: دار طوق النجاة ۱۴۲۲ء) ۱۹۱:۶ حدیث نمبر: ۵۰۲۳

43 - آپ کا پورا نام سفیان بن عیینۃ بن میمون ہے، بہت بڑے محدث تھے. کوفۃ میں ۱۰۷ھ کو پیدا ہوئے جبکہ ۱۹۸ھ کو مکہ میں فوت ہوئے. الجامع في الحديث آپ کی شاہکار کتاب ہے۔ مزید تفصیل کے لئے دیکھئے: الذہبي، شمس الدين، **تذكرة الحفاظ** (بيروت: دار الكتب العلمية ۱۹۹۸ء) ۱۹۳:۱

44 - القرآن، ۱۶:۷۰

45 - آپ کا پورا نام عبد القادر بن ولي الله دہلوي ہے. بہت نامور عالمِ دین تھے، "موضح القرآن" کے نام سے اردو زبان میں قرآن کریم کا ترجمہ لکھا۔ ۱۲۳۰ھ کو فوت ہوئے۔ دیکھئے: عبد الحي الطالبي، نزهة الخواطر وبهجة المسامع والنواظر، (بيروت: دار ابن حزم، ۱۹۹۹ء) ۳۰۲:۷

46۔ فراہي، **التکمیل في أصول التأويل، ۲۷۲**

47۔ تفسير الماتريدي، (بيروت، لبنان: دار الكتب العلمية ۲۰۰۵ء) ۱۰:۲۰۳

48۔ تفسير النسفي (بيروت، لبنان: دار الكلم الطيب، ۱۹۹۸ء) ۳:۵۳۷

49۔ القرآن، ۳:۱۶۴

50۔ القرآن، ۲: ۱۲۷-۱۲۹

51۔ فراہي، **التکمیل في أصول التأويل، ۲۷۳**